Al-Hikmat
Volume 27 (2007), pp. 1-17

شرف آدم کا نقیب...... اِقبالؒ

شمیم روشن آرا *

خلاصہ۔علامہ محمد اِقبالؒ کے فلسفے اور شاعری کے اثرات نہ صرف اس کے عہد کے علمی، ادبی اور سماجی رویوں پر مرتب ہوئے بلکہ بعد میں آنے والی نسلیں بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکیں۔ اِقبال کو ایک حساس دل کے ساتھ مفکرانہ ذہن عطا ہوا تھا جسے حقیقت عالم جاننے کی جستجو تھی۔ اِقبال نے فکری طور پر بھی مکمل تحقیق و دانش کے ساتھ زندگی، اس کی غایت و حقیقت کا مطالعہ کیا اور اپنے خطبات و خطوط میں عقلی دلائل کے ساتھ اپنے نتائج کو پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی اِقبال نے اپنے دل کی لگن، تڑپ اور جذبہ کی آمیزش کے ساتھ اپنے فلسفہ اور تفکر کو اپنی شاعری کے ذریعہ بھی عام کیا۔

اِقبال کی علمی تحقیقات اور خطبات سے علماء اور دانشوروں کا محدود طبقہ ہی براہ راست مستفید ہو سکتا تھا مگر شاعری کے ذریعہ ان کی سوچ علم دوستوں کے ساتھ ساتھ ادب دوستوں اور عوام تک بھی منتقل ہوئی۔ اِقبال کے فلسفہ اور شاعری دونوں کے دو بڑے محور ہیں۔ اول ''انسان'' اور اسی کے حوالہ سے موجودات عالم ''نظام کائنات'' اس کا مقصد و غایت اور سب سے بڑھ کر انسان کی اپنی حیثیت و مقام۔ اسی ضمن میں مابعد الطبعی موضوعات مثلاً تصور حیات و ممات، زمان و مکان، خالق کائنات اور خودی جیسے موضوعات اور دوم ''مملکت'' اور ''ملت'' کا تصور، اس کی ماہیت، ترقی و تنزل کے اسباب وغیرہ۔ اس سلسلہ میں ''ملت اسلامیہ'' پر ان کی خصوصی توجہ ہے جس کی زبوں حالی سے اِقبال اکثر دل گرفتہ رہتے ہیں اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے امکانات پر غور و فکر اور رہنمائی ان کے محبوب موضوعات ہیں۔

---

* ڈاکٹر شمیم روشن آرا، ایڈیٹر کم لیکچرر، اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

اپنے فکری ارتقا کے ابتدائی دور سے ہی اقبال ''انسان'' کو خالق کائنات کی سب سے برتر تخلیق سمجھتے ہیں جسے ان کے نزدیک ''آگہی''، ''آرزو'' اور ''اختیار'' عطا کر کے خالق کائنات نے اسے دوسرے موجودات عالم پر فضیلت دی ہے۔ انسان مجبور محض نہیں بلکہ بقول اقبال خدائے لم یزل کا دست قدرت و زبان ہے، نائب اللہ فی الارض ہے جس کے تصرف میں بادل، ہوائیں، گنبد افلاک غرض قدرت کے تمام وسائل ہیں۔ اقبال کے نزدیک انسان اپنی ذات میں بے کنار بھی ہے اور ایک ادراک وفہم کے ساتھ ساتھ فعال قوت بھی رکھتا ہے لیکن اس قوت کی پرورش اور ترقی کی ضرورت ہے جو محنت شاقہ اور ضبط نفس کی طلب گار ہے۔ انسان کے ضمیر میں پوشیدہ اس فعال قوت کے اظہار کے لیے اقبال نے ''خودی'' کا لفظ اختراع کیا ہے اور خودی کی تشریح اپنے مقالات، خطبات اور شاعری میں جابجا کی ہے۔ اقبال نے خودی کی پرورش پر زور دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک خودی کی ترقی وبلندی ہی انسان کو برتر بناتی ہے اور وہ قوت بخشتی ہے جس کے بل بوتے پر وہ تقدیر بدل سکتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی طبعی قوت سے اس کا جوہر نہیں مرتا۔

اقبال کا ''مرد مومن'' وہ ہے جس نے اپنی خودی کی پرورش کی اور اسے ارفع مقام تک پہنچایا۔ مرد مومن کی طاقت کا راز ''لا الہ الا اللہ'' میں ہے جو اسے ہزار آستانوں پر سجدہ ریز ہونے سے بچاتا ہے۔

انسان کے منصب ومقام کے سلسلہ میں اقبال نے براہ راست قرآن کریم سے راہنمائی حاصل کی ہے اور یہی استدلال اپنے خطبات وشاعری میں پیش کیا ہے۔ اپنے خطبات میں اقبال بیان کرتے ہیں کہ کتاب اللہ سے تین باتیں ثابت ہیں۔

(۱) انسان اللہ کا منتخب کردہ اور ہدایت یافتہ ہے۔

(۲) انسان اپنی خامیوں کے باوجود زمین پر اللہ کا نائب ہے۔

(۳) انسان ایک بار گراں کا امین ہے۔

شرف آدم اور بقائے دوام کے سلسلہ میں بھی اقبال نے قرآن سے رہنمائی حاصل کی اور اس پر استدلال کیا کہ یہ ہر شخص کا مقدر نہیں بلکہ صرف ایسے انسانوں کے لیے بقائے دوام کی بشارت ہے جنہوں نے اپنے جوہر انسانیت کی حفاظت کی اور اپنی کوشش وجد وجہد یعنی تقویٰ اختیار کرتے ہوئے خود کو خالق

کائنات کے نائب کی حیثیت تک پہنچایا۔ اقبال کے نزدیک انسان کا اپنا عمل اور کوشش ہی اس کے مقام اور درجات کو متعین کرتے ہیں۔

اقبال بلاشبہ شاعری اور فلسفہ کا سب سے اہم نام اور توانا آواز ہے جس کے فوری اور گہرے اثرات نہ صرف اس کے عہد کے ادبی، فلسفی وسماجی رویوں پر مرتب ہوئے بلکہ بعد میں آنے والی نسلیں بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکیں۔ تمام عظیم شعراء کی طرح شعر گوئی کی وہی صلاحیت اقبال کے لیے بھی عطیہ خداوندی تھی۔ مزاجاً وفطرتاً وہ ایک مفکر تھے جسے ایک حساس اور دردمند دل بھی عطا ہوا تھا۔ ایک بے تاب روح حقیقت عالم کی جستجو میں تھی۔ اسے جاننے پہچاننے اور ماننے (حقیقت عالم کی عظمت کا اعتراف اور صرف اسی سے نیازمندی) کے لیے بے چین و بے قرار

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں[1]

یہی تڑپ ان کی شاعری اور فلسفہ میں نظر آتی ہے۔ اسی تمنا کے زیر اثر اقبال کی فطری تحقیق و جستجو کا سفر بتدریج جاری رہا۔ حقیقت کلی تک رسائی مطمع نظر ٹھہری جس نے جذبۂ عشق کی شکل اختیار کر کے دل کو سوزوگداز سے آشنا کر دیا۔ یہ فکروجذبہ محض شوق نہیں تھا بلکہ اس میں اپنی ملت کا درد اور صحیح سمت میں اس کی رہنمائی، آزادی وترقی کا مقصد بھی پیش نظر تھا۔ اقبال کی شعرگوئی کی بے پناہ صلاحیت اپنی جگہ مگر خود انہوں نے اپنی شعرگوئی کی صلاحیت کا لوہا منوانے کے لیے عشق سخن نہیں کی بلکہ شاعری کو اپنی فکرو پیغام کی ترویج کے لیے برتا۔ اگرچہ اقبال کے خطبات سے بھی ان کی فکری نہج کا اندازہ ہوتا ہے مگر نثر میں اس جذبہ کو سمونے کی گنجائش کم تھی جو ان کے اندر موجزن تھا اور جسے وہ دوسروں تک منتقل بھی کرنا چاہتے تھے۔ شعر میں جذبہ وفکر دونوں سمونے کی گنجائش تھی اور اس کا دائرہ ابلاغ واثر بھی وسیع تھا۔ اس کا اظہار خود اقبال نے بھی کئی جگہ کیا ہے۔ ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاءاللہ میں شامل ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کا وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو

مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ وقت میں میرے لیے ممکن نہیں۔''[۳]

اقبال کے کلام میں ان کا فکری ارتقاء درجہ بدرجہ ظاہر ہوتا ہے مگر اقبال کے فکر کے دو بڑے محور ہیں۔ اول ''انسان'' اور اسی حوالہ سے موجودات عالم، نظام کائنات اس کی مقصد و غایت اور سب سے بڑھ کر اس سارے نظام میں انسان کی اپنی حیثیت و مقام۔ اس ضمن میں مابعدالطبعی موضوعات مثلاً تصور حیات و ممات، زمان و مکان، خالق کائنات اور خودی جیسے موضوعات میں ان کی دلچسپی بڑھتی ہے اور ''انسان'' کی حیثیت و مقام کے تعین کے حوالہ سے ہی وہ ان معاملات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہے۔

اقبال کی سوچ کا دوسرا محور ''ملت اسلامیہ'' ہے جس کی زبوں حالی انہیں افسردہ رکھتی ہے اور جس کے جسد خاکی میں وہ نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ملت اسلامیہ کے عروج و زوال، موجودہ زبوں حالی کے اسباب و علل پر غور و فکر اور ملت کی نشاۃ ثانیہ کے امکانات کا جائزہ اور اس سمت میں رہنمائی پر مشتمل ہے۔ محققین اقبال نے ان کی شاعری و فکری ارتقاء کے مختلف ادوار بیان کیے ہیں اور فیض احمد فیض کے مطابق فکری ارتقاء کے انہی ادوار کی مناسبت سے اقبال کے شاعرانہ پیرایۂ اظہار میں بھی نمایاں تبدیلیاں نظر آتی ہیں مگر فی الوقت اس مضمون میں یہ ہمارا موضوع بحث نہیں ہے۔

اقبال کی شاعری کے پہلے دور کو تحیر کا دور کہا جا سکتا ہے جس میں وہ مناظر قدرت کے مشاہدے میں منہمک اور اس مشاہدے کے نتیجے میں تحیر کا شکار ہیں۔ قدرت کی بوقلمونیاں حیرت کا سبب بنتی ہیں اور کئی طرح کے سوالات کو جنم دیتی ہیں۔ اگرچہ ان کے موضوعات مناظر قدرت مثلاً چاند، ستارے، پہاڑ، جگنو، پرندے ہیں مگر اس مشاہدہ میں بھی بے قراری کی کیفیت اور غور و فکر کے پہلو نمایاں ہیں۔ یہاں بھی انہیں سب سے بڑھ کر کائنات اور اس کے موجودات کے درمیان انسان کی حیثیت اور مقام کی کھوج بے چین رکھتی ہے۔

ہمالہ

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن تیرا[۳]

خفتگانِ خاک سے

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے[۴]

شمع

میں حسن ہوں کہ آپ سراپا نیاز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں[۵]

بچہ و شمع

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں یہ کیوں نالاں ہے مثل جرس[۶]

کنار راوی

جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا[۷]

غزل

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہوں میں[۸]

اقبال کی شاعری کے دوسرے دورکوان کے قیام یورپ کےزمانے سے منسوب کیا جاتا ہے۔اس دور میں ان کی توجہ کا جھکاؤ مناظر قدرت اور مشاہدے سے ہٹ کر اپنے وطن واہل وطن کی جانب ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ وہ وقت ہے جب وہ خارجی دنیا کی نسبت اپنے من کی دنیا میں ڈوب کر اسرار ورموز کا انکشاف و ادراک کرتے ہیں۔فیض احمد فیض کے خیال میں اس دور کا اختتام اور اگلے دور کی ابتدا مثنوی اسرار ورموز سے ہوتی ہےاوراس کا ارتقائی عمل بتدریج ''پیام مشرق''اور''بال جبریل''میں تکمیل تک پہنچتا ہے۔ارمغان حجاز میں بھی اس کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔[۹] یہ دورسوز وگداز اور محبت کے فلسفہ سے عبارت ہے۔سوچ کے ساتھ جذبہ دروں بھی شامل ہے جو بالآخر عشق کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔فکری ارتقاء کے آخری دور میں راز ہائے کائنات منکشف ہوتے ہیں۔ یہ عرفان حق اور عرفان ذات کی منزل ہے۔ یہاں اقبال حقیقت و درجات، خالق ومخلوق، کائنات وانسان،ان کے باہمی ربط وامکانات واضح کرتے ہیں اوروہ اپنی تمام تر فکری کاوش اورجذب دروں کو دوسروں تک پہنچانے کی آرزو وسعی کرتے ہیں۔نقطہ ارتکاز یہاں بھی انسان ہی ہےاوردوسرے موضوعات اسی حوالے سے اہمیت پاتے ہیں کہ وہ انسان کے لیے کس قدر اہم ہیں۔اس پر کس طرح اثر انداز ہوئے ہیں اوراس کی ترقی میں کیا کردارادا کر سکتے ہیں۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے اقبال کو یقین ہو چلا تھا کہ''انسان'' خالق کی اہم ترین تخلیق ہے جسے خدا نے''آگہی''کے ساتھ ساتھ''اختیار'' بھی دیا ہے۔وہ اپنی فکروعمل کی راہیں اورسمت متعین کرسکتا ہےاورخوداپنی ذات کی تعمیر کے لامحدودامکانات رکھتا ہے۔

فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد[۱۰]

اپنے فکری ارتقاء کے ابتدائی دور سے ہی اقبال کو یہ احساس ہے کہ انسان دوسرے موجودات یا

فطرت کے دوسرے مظاہر سے اس لحاظ سے مختلف اور برتر ضرور ہے کہ اسے ''آگہی'' حاصل ہے اور اس کے دل میں ''آرزو'' کی چنگاری ہے۔ اگرچہ یہ آگہی و آرزو اسے بے چین و بیقرار رکھتی ہے اور کبھی آزردہ خاطر بھی مگر یہی اسے دوسرے موجودات سے ممیز بھی کرتی ہے۔ ''گلِ رنگین'' سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

اس چمن میں، میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو
مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ شوقِ جستجو رہتا ہوں میں[۱۱]

یا

شمع سے کہتے ہیں:

یہ گہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار
خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
بستاں و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی
اصلِ کشاکشِ من و تو ہے یہ آگہی[۱۲]

یا

نظم انسان: قدرت کا عجب یہ ستم ہے:

انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے[۱۳]

مگر بالآخر اقبال اپنی تحقیق وجستجو سے اپنے ذہن میں اٹھنے والے دیگر سوالات کے جوابات تلاش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''انسان'' مجبورِ محض'' نہیں بلکہ خدائے لم یزل کا دست قدرت وزباں ہے۔ انتخاب وعمل کے لامحدود امکانات کا حامل آیۂ کائنات کا معنی دیریاب ہے۔ دیگر تمام موجودات عالم سے برتر اور خالق سے قریب تر نائب اللہ فی الارض ہے جس کے تصرف میں بادل، ہوائیں، گنبدِ افلاک غرض قدرت کے تمام وسائل ہیں۔

اور اس کا مقام

برتر از گردوں مقام آدم است[14]

آیۂ کائنات کا معنی دیریاب تو
نکلے تیری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو[15]

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے[16]

مگر ساتھ ہی اقبال جانتے ہیں کہ فضیلت کے اس مقام تک پہنچنے کے لیے انسان کو محنت اور خود کو اس مقامِ برتر کا اہل ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اپنے جوہرِ انسانیت کی پرورش کرنا شرط ہے جسے اقبال نے ''خودی'' کا نام دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان اپنی ذات میں بے کنار بھی ہے اور ادراک وفہم کے ساتھ فعال قوت بھی رکھتا ہے۔ انسان کے ضمیر میں پوشیدہ اس فعال قوت کے اظہار کے لیے اقبال نے خودی کا لفظ اختراع کیا ہے اور اس کی تشریح اپنے مقالات، خطبات اور شاعری میں جابجا کی ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی ایک ایسی پراسرار شے ہے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ اقبال کے ہاں خودی سے انسان کی قوت ارادی، ضبطِ نفس وقوتِ عمل کے لامحدود امکانات کا تصور وابستہ ہے۔ اکثر ناقدین کا یہ تصور درست نہیں کہ علامہ اقبال نے خودی کا تصور مغرب کے فلسفیوں سے اخذ کیا ہے۔ اقبال نے خود یہ بات ''اسرارِ خودی'' کے انگریزی مترجم ڈاکٹر نکلسن کو اپنے طویل خط میں ظاہر کی تھی کہ ان کا خودی کا فلسفہ براہ راست اسلام سے ماخوذ ہے اور وہ اس معاملہ میں مسلم صوفیائے

کرام سے متاثر ہیں۔

اکثر اسلامی علماء و صوفیائے کرام کے ہاں ''عرفانِ نفس'' اور اس کے مختلف مدارج کا تذکرہ ملتا ہے۔ اقبال نے بھی خودی کے لفظ کو اس ''جوہرِ انسانیت'' کے لیے استعمال کیا ہے جس کا تعلق انسان کے فانی جسم سے نہیں بلکہ اس کی روح سے ہے۔ اکثر اسلامی علماء کے خیال میں انسان کے وجود کی دو حیثیتیں ہیں۔ایک ''انسانی جسم'' جو مٹی سے بنا ہے اور اسے فنا ہو کر مٹی میں ملنا ہے اور دوم ''انسانی روح'' جس کا خمیر مٹی سے نہیں اٹھایا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے مطابق وہ اس کا ''امر'' ہے جو جسمانی موت سے نہیں مرتی۔روح کی بالیدگی ہی عام انسان کو اشرف المخلوقات کے مقام تک پہنچاتی ہے اسی خودی کی پرورش اور نگہداشت پر اقبال نے بھی زور دیا ہے۔نیک و بد کی پہچان، اخلاقی اقدار، تمیزِ حق و باطل اور صداقت کے لیے مرنے کی تڑپ جیسی اہلیتوں اور جذبات کا تعلق روح سے ہے اپنی روح کو جاننا گویا اپنی حقیقت کو پہچاننا ''عرفانِ نفس'' ہے۔ اقبال کا اسرار بھی یہی ہے کہ خودی کی پہچان سے ہی انسان کو اپنی حیثیت اور اختیار کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی کی بدولت وہ مقامات بلند تک پہنچ سکتا ہے۔

اقبال کے نزدیک ''خودی'' کوئی جامد و ساقط اور سراپا تسلیم و رضا نہیں بلکہ با اختیار اور فعال ہے۔ اقبال عبد اور معبود دونوں کی علیحدہ علیحدہ حیثیت تسلیم کرتے ہیں مگر عبد کو نہ ہی تو مجبورِ محض سمجھتے ہیں اور نہ ہی عقیدہ ''وحدت الوجود'' کے مطابق اسے حقیقتِ کلی کا ایک حصہ۔وہ ''انسان'' کو خالق کی ایک تخلیق کا درجہ تو دیتے ہیں مگر ایک ایسی تخلیق جو خالق کا شاہکار ہے جس میں نمو کے بے پناہ امکانات ہیں اور جو خیر و شر کے درمیان تمیز کی اہل ہے۔امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے اسباب پر غور کرنے کے دوران بھی اقبال اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ وقت کے ساتھ اسلام کے عقیدۂ توحید میں افلاطونی اور ویدانتی تصورات بالخصوص عقیدہ ''وحدت الوجود'' اس طرح شامل ہو گئے جنہوں نے قرآنی تعلیمات کے برعکس ایک مخصوص بے عملی، ترکِ دنیا، غیر اسلامی تصور، تسلیم و رضا اور قناعت کے تصور کو فروغ دیا۔ان تصورات کو عجمی شعراء نے اپنی جادو بیانیوں سے خاص و عام میں پھیلایا۔عقیدہ ''وحدت الوجود'' کی رو سے چونکہ حقیقت ابدی (ذاتِ خداوندی) ہی واحد حقیقت ہے اور انسان کی ذات اعتباری ہے تو ایک بے عملی، کمتری اور بے وقعتی کے احساس کے ساتھ ساتھ ایک منفی قسم کی قناعت توکل اور جزاء و سزا کے تصورات نے جگہ بنا لی جس کا

مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے نقصان ہوا۔ اقبال نے دیباچہ ''اسرار خودی'' میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اقبال کا ''مردمومن'' وہ ہے جس نے اپنی ''خودی'' کی پرورش وحفاظت کی۔ اپنی آزادی، عزت، حمیت اور انسانیت کا سودا نہ کیا اور جس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں نے اس کا سر ہر در پہ نہ جھکایا۔ وہی ''مرد مومن'' کہلایا۔ اقبال کا ''مردمومن'' نیٹشے یا کسی اور فلسفی کے ''فوق البشر'' یا ''سپر مین'' سے ماخوذ نہیں بلکہ براہ راست اسلام کے ''مردمومن'' کا تصور ہے جس کا منبع قوت ذات واحد پر ایمان ہے اور جس کی برتری کا معیار ''تقویٰ'' ہے۔ جو بظاہر تو قاری نظر آتا ہے مگر اپنے عمل سے خود تفسیر قرآن ہے۔ اس کی خودی و خوداری ہزار آستانوں پر سجدوں کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ ہے[۱۷]

اور اقبال کے نزدیک یہی اس کی طاقت کا راز ہے۔

مرد سپاہی ہے وہ، اس کی زرہ لا الہ
سایہ شمشیر میں اس کی انا لا الہ[۱۸]

علامہ محمد اقبال نے اپنے انگریزی خطبات میں انسان کے منصب ومقام کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کے سلسلے میں براہ راست قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کی ہے اور اپنی شاعری میں بھی اکثر قرآن سے حوالے دیتے ہیں۔ اپنے چوتھے خطبے ''The Human Ego, His freedom mortality'' میں بیان کرتے ہیں کہ کتاب اللہ سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں۔[۱۹]

(۱) انسان، اللہ تعالیٰ کا منتخب کیا ہوا اور ہدایت یافتہ ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی آیات

آیت: ''پھر اس کے رب نے اسے (آدم کو) چن لیا، اس کی طرف ملتفت ہوا اور اسے راہ دکھائی (القرآن: ۲۰:۱۲۲)

(۲) اپنی خامیوں کے باوجود وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے:

آیت: ''اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں تو وہ بولے، کیا آپ وہاں ایسے کو نائب بنائیں گے جو اس میں فساد کرے اور خون بہائے اور ہم آپ کی پاکیزگی اور بڑائی بیان کرتے ہیں؟ رب نے جواب دیا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔(القرآن: ۲:۳۰)

(۴) انسان ایک بارگراں کا امین ہے جسے اس نے خود کو خطرے میں ڈال کر قبول کیا۔(گویا اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار تھا)

آیت: ''ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو پیش کیا۔سو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے۔انسان نے اس(بارِ امانت) کو اٹھا لیا۔وہ دراصل زیادتی کرنے والا اور بے سمجھ تھا۔''(القرآن: ۳۳:۷۲)

اقبال نے اس کی عکاسی یہ کہہ کر کی ہے:

سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں
ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں، جاہل ہوں میں[۴۰]

اقبال کے نزدیک انسان اپنے طبعی وجود سے نہیں بلکہ اپنے جوہرِ حیات (روحانی قوت) کی بناء پر افضل ہے۔اسے اقبال نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔اپنی خودی کی تعمیر ہی انسان کو اس ارفع درجے تک پہنچاتی ہے کہ

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں[۴۱]

اور ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جب اپنے رب کی رہنمائی سے منور ہو کر اس کے قول و عمل اور خدائے برتر کی رضا میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان[۴۲]

یہ وہ مقام ہے جب اللہ تعالیٰ بھی بندے سے پوچھتا ہے کہ تیری رضا کیا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے[۴۳]

اس ضمن میں ذرا طائف کا واقعہ یاد کیجیے جب رسالت مآب حضرت محمد ﷺ طائف کے لوگوں کی بدسلوکی سے رنجیدہ خاطر تھے۔ اللہ نے فرمایا ''اگر تم کہو تو پہاڑ ٹکرا کر انہیں تباہ کر دوں۔''

رحمت للعالمین نے فرمایا ''میرے رب یہ ناسمجھ ہیں'' اور ان پر رحم کی درخواست کی۔ اقبال کے نزدیک انسان کا ایک افتخار یہ ہے کہ وہ ''زندانی تقدیر'' نہیں بلکہ اپنے ارادے اور عمل سے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا اہل ہے۔ اس کے سامنے مختلف راہیں (Choice Options) ہیں۔ جنہیں منتخب کرنے اور اختیار کرنے میں وہ مجبورِ محض نہیں بلکہ آزاد ہے۔ اس آزادی کی بناء پر اپنے ارادے و عمل کی پوری ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے۔

ناچیز جہانِ مہ و پرویں تیرے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد[۴۴]

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں[۴۵]

زندگی مردِ مومن کے لیے ایک جہاد ہے۔ اپنی خودی و خودنگری کی تربیت گاہ۔ جس کے لیے قوتِ ایمانی، یقینِ محکم، جہدِ مسلسل اور فاتحِ عالم (حضرت محمد ﷺ) سے نسبت و محبت اس کے ہتھیار ہیں۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں[۴۶]

اقبال ''یقین'' کی بھی تعمیرِ خودی میں خصوصی اہمیت بتاتے ہیں۔ وہ بار بار یقین کی قوت کا ذکر کرتے

اور یقین پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ''یقین'' کو اقبال نے ''ایمان'' کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے[۴۷]

جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں[۴۸]

جیسا کہ ابتداء میں بھی بیان کیا گیا ہے اقبال نے قضا وقدر، زمان ومکاں، حیات وممات کے تصورات کو بھی انسان کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان کی ذات میں موجود جوہر حیات جسمانی موت سے نہیں مرتا۔ یہ زمان ومکاں کی قیود سے آزاد اور بلند تر شے ہے بلکہ کبھی کبھی تو جسمانی موت اس کے لیے حیات ابدی ہوتی ہے۔

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی[۴۹]

....

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
تیرے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے[۳۰]

زمان ومکاں سے متعلق علامہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں شامل نظم ''تمہید زمینی'' میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ اپنے خیالات کو انہوں نے مولانا روم سے ملاقات میں ایک گفتگو کے طور پر پیش کیا ہے جس میں وہ معراج انسانی کے اسرار ورموز پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی اقبال قرآن شریف کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور درج ذیل آیت کا حوالہ دیتے ہیں۔

''اے انسان وجن! اگر تم میں یہ استطاعت ہے کہ ان آسمانوں اور زمین کی حدود سے تجاوز کر سکو تو کر کے دیکھ لو۔ تم نہیں کر سکتے مگر ''سلطان'' سے۔'' (القرآن: ۳۳:۵۵)

گویا اس آیت میں مکانی حدود سے نکلنا عام حالات میں امکانی نہیں بتایا گیا مگر اس کی ایک صورت

بتائی گئی ہے کہ اگر ''سلطان'' ہو تو اس کے ذریعے ممکن ہے مگر سوال اٹھتا ہے کہ ''سلطان'' کیا ہے؟ اقبال کے نزدیک یہ وہ ''قوت'' ہے جو اپنی ذات کی تسخیر سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کی بناء پر انسان صرف اپنے محسوسات کے ذریعے ہی ادراک نہیں کرتا بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی روحانی قوت کی بدولت ماورائے محسوسات بھی ادراک حقیقت کرسکتا ہے اور زمان و مکان کی حدود سے آگے نکل سکتا ہے۔

گفت اگر سلطان تیرا آید بدست
می تواں افلاک را از ہم شکست
باش تا عریاں شود ایں کائنات
شوید از داماں خود گرد جہات

....

عشق سلطان است و برہان مبیں
یہ دو عالم عشق را زیر نگیں
لا زماں و دوش و فردائے آرزو
لا مکاں و زیر و بالائے آرزو[۳۱]

یہاں ایک بات غور طلب ہے کہ شرف آدم اور بقائے دوام کو اقبال نے ہر شخص کا مقدر نہیں بتایا بلکہ ان انسانوں کا جو اپنی خودی کی تعمیر کرتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بقائے روح یا بقائے خودی بہر حال ایک انعام، ایک جزا، ایک صلہ ہے جو فقط انہی کو نصیب ہوگا جو اس کے لیے مناسب جدوجہد کریں گے اور اس کے اہل نکلیں گے۔ بقا مفت نہیں ملے گی۔ اس کی خیرات نہیں بٹے گی بقا حاصل کی جاتی ہے ملتی نہیں۔[۳۲]

اقبال خودی کی تربیت پر زور دیتے ہیں جو ان کے خیال میں عمل صالح سے مضبوط ہوتی ہے۔ راہ حق میں جدوجہد اور تقویٰ اسے بقائے دوام بخشتا ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف

کہ مشک خاک میں پیدا ہوں آتش ہمہ سوز
یہی ہے سِرِّ کلیمی ہر اک زمانہ میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز[۳۳]

اور یہی اس کا انعام ہے۔انسان کا عمل ہی اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ اس کا کیا مقام ہے۔کس درجے پر وہ فائز ہے۔انسان کا یہی ارادہ اور اختیار جس سے نواز کرا سے کائنات میں افضل ترین مقام دیا گیا اس کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے کہ جیسی راہ عمل اس نے اپنے لیے منتخب کی ہوگی ویسے ہی درجے پر وہ فائز ہوگا۔

اقبال کے نزدیک زندگی وہ عرصہ امتحان ہے جس میں خودی کو اپنے عمل کے ذریعہ نموو فروغ کے بے انتہا مواقع ملتے ہیں۔موت اس کا پہلا امتحان ہے جس کے ذریعہ خودی کی استواری اور استحکام کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔اقبال کے نزدیک موت انسان کا انجام نہیں ہے بلکہ اسے موت کے بعد اس کا حساب دینا ہے کہ اپنی خودی کی نمو کے لیے اس نے کہاں تک تگ و دو کی۔اپنی اہلیتوں، صلاحیتوں اور اختیار کو کیسے استعمال کیا۔ اقبال کا خیال ہے کہ زندگی کا پیکر اگر چہ ناپائیدار سہی مگر خود زندگی پیمانۂ امروز و فردا سے نہیں ناپی جا سکتی۔ یہ جاوداں، پیہم دواں ہر دم جواں ہے۔اقبال انسان کے مادی وجود کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جو موت کے ساتھ مر جاتا ہے مگر ان کا مطمع نظر وہ جوہرِ انسانیت ہے جس کی بنا پر نہ صرف یہ کہ انسان میں فوق البشر بننے کے امکانات موجود ہیں بلکہ تحت البشر کے طور پر پستیوں میں گرنے کے بھی اسی قدر خطرات موجود ہیں۔جب ہی اقبال کہتے ہیں:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری[۳۴]

حوالہ جات

۱ علامہ اقبال، بانگ درا، کلیات اقبال، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ص۲۱۷

۲ اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، ۱۰۸:۱، شیخ محمد اشرف تاجر کتب، کشمیری بازار، لاہور۔

۳ بانگ درا، ص۱۰

۴ ایضاً، ص۲۳

۵ ایضاً، ص۴۸

۶ ایضاً، ص۶۸

۷ ایضاً، ص۶۵

۸ ایضاً، ص۷۶

۹ فکر اقبال کے منور گوشے، مرتبہ سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ص۱۳

۱۰ علامہ اقبال، پیام مشرق، کلیات اقبال، تسخیر فطرت، ضمنی عنوان میلاد آدم، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ص۸۵

۱۱ بانگ درا، ص۱۱

۱۲ ایضاً، ص۲۷

۱۳ ایضاً، ص۹۳

۱۴ اقبال کا طویل خط ڈاکٹر نکلسن کے نام جس کا ترجمہ ''فلسفہ سخت کوشی'' کے عنوان سے اقبال نامہ، ج۱ میں موجود ہے۔

۱۵ علامہ اقبال، بال جبریل، کلیات اقبال، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ص۹۳

۱۶ ایضاً، ص۹

۱۷ علامہ اقبال، ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ص ۱۵
۱۸ بالِ جبریل، ص ۷۹
۱۹ علامہ اقبال، *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* کشمیری بازار، لاہور، ص ۹۵
۲۰ بانگِ درا، ص ۷۶
۲۱ بالِ جبریل، ص ۹
۲۲ ضربِ کلیم، ص ۵۶
۲۳ بالِ جبریل، ص ۴۵
۲۴ ضربِ کلیم، ص ۶۲
۲۵ بالِ جبریل، ص ۳۶
۲۶ بانگِ درا، ص ۲۱۰
۲۷ ایضاً، ص ۲۰۸
۲۸ ایضاً، ص ۲۱۰
۲۹ ایضاً، ص ۱۹۸
۳۰ ضربِ کلیم، ص ۵۷
۳۱ علامہ اقبال، جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال، تمہید زمین، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۲۰
۳۲ پروفیسر محمد عثمان: انسانی انا، اس کی بقا اور اختیار، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۳۰۱
۳۳ ضربِ کلیم، ص ۶۵
۳۴ بانگِ درا، ص ۲۱۲